R. No. 2186/57

Regd. No. A. 927

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

Telephone No.

Telegrams "ANJUMAN"

ہماری زبان

جلد ۲۱ - شمارہ ۳۶ | ایڈیٹر - آل احمد سرور | علی گڑھ - ۲۲ ستمبر ۱۹۶۲ء

ابوعلی ندوی

صاحب شعرالہند کی یاد میں دو خاص نمبر

ہماری زبان علی گڑھ کے ۲۲ر مارچ ۱۹۶۲ء کے شمارے میں میرے عزیز دوست خلیل الرحمٰن صاحب اعظمی نے جامعہ اُردو کے ماہنامہ ادیب کے عبدالسلام نمبر پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے: کہ "مولانا عبدالسلام مرحوم صاحب شعرالہند کی علمی اور ادبی خدمات کا اعتراف تو غالباً اُردو کے تمام ادیبوں، اور نقادوں نے کیا ہے، لیکن اس اعتراف وقبول کا اظہار جیسا کہ ہونا چاہیئے نہیں ہوا۔ ان کے انتقال پر ہند و پاکستان کے تمام ادبی حلقوں میں کلیتہً خاموشی تو تھی ہی جس کا کچھ زیادہ شکوہ نہیں تھا، لیکن حیرت ہے کہ خود دارالمصنفین کا رسالہ معارف بھی جہاں سے مولانا مرحوم تمام عمر وابستہ رہے، اور اس کی چہار دیواری سے باہر نہیں نکلے، ان کی یادگار میں کوئی خاص نمبر نہ نکال سکا جس کے بجا طور پر وہ مستحق تھے، اور اس کے قدردانان شبلی اسکول قدرتی طور پر متوقع و منتظر تھے"

جس طرح معارف کا سلیمان نمبر شائع ہوا تھا، اور ملک کے بڑے بڑے ارباب قلم سے مضامین لکھوائے گئے تھے، جو اس نمبر کی زینت ہیں، خواہش کہ اسی طرح اسی شان کے ساتھ مولانا شبلی کے دوسرے جلیل القدر شاگرد، اور ان کے ادبی جانشین مولانا عبدالسلام مرحوم کی یادگار میں بھی خاص نمبر نکالا جاتا، اور مولانا کے واقف کار اور دوسرے ارباب قلم سے ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر مضامین حاصل کئے جاتے، لیکن بدقسمتی سے ایسا نہ ہوسکا، اس کے بہت سے اسباب ہیں، ایک بڑا سبب تو یہ تھا کہ سیرۃ النبی، سیرت عائشہ، ارض القرآن، عرب و ہند کے تعلقات اور عربوں کی جہازرانی، اور خیام جیسی اہم اور اردو کی شاہکار کتابوں کے مصنف کی غیر معمولی شخصیت کے پیش نظر، اس کے نام پر، خاص نمبر کا جتنا شدید تقاضا تھا، اتنا توقع کے خلاف وہ نہ نکل سکا، اور اب تک پڑا ہوا ہے، جب ملک کی سرد مہری کا یہ عالم ہے تو شعرالہند و اسوۂ صحابہ کے مصنف کے نام پر خاص نمبر نکالنے کی کیا ہمت کی جاتی، اور پھر ان پر مضمون لکھنے کی کس سے توقع کی جاتی، ان ساری دشواریوں، دقتوں اور پریشانیوں کے خیال سے جو سلیمان نمبر کے نکالنے میں یہاں کے ارباب کار کو پیش آئی تھیں، عبدالسلام نمبر نکالنے کا ارادہ ترک کر دیا گیا، ایک مخصوص مجلس میں جس میں مولانا عبدالماجد دریابادی اور مولانا ابوالحسن علی ندوی بھی شریک تھے، مولانا عبدالسلام ندوی اور مولانا مناظر احسن گیلانی جن کا ابھی ابھی انتقال ہوا تھا، ان کی یادگار میں ایک مشترکہ خاص نمبر شائع کرنے کی تجویز آئی تھی، لیکن بوجوہ یہ بھی عمل میں نہ آسکی،

مولانا عبدالسلام ندوی اُردو کے بہت بڑے اور مقبول ترین مصنف تھے، اُردو کے شبلی اسکول کے پیرو تھے، مولانا شبلی کے شاگرد خاص تھے، مولانا شبلی نے ان کے لئے جو پیشین گوئیاں کی تھیں وہ ایک ایک کرکے انھوں نے پوری کیں، انھوں نے شعرالہند ابن یمین اور اقبال کامل جیسی ادبی و تنقیدی، اسوۂ صحابہ، سیرت عمر بن عبدالعزیز، امام رازی جیسی دینی و تاریخی کتابیں لکھیں، اور انقلاب الامم، تاریخ فقہ اسلامی، اور ابن خلدون جیسی مختلف الموضوع کتابوں کے ترجمے کئے، اور اس طرح سے اُردو کے علمی و ادبی سرمایہ میں بیش بہا اضافہ کیا، شعرالہند تو بعض کالجوں اور یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہے، اور اس کی وجہ سے اس کے اب تک متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں، یہ آزاد کی آب حیات کے بعد اردو کی دوسری کتاب ہے جو اس موضوع پر لکھی گئی، جس میں مصنف نے اپنے اُستاد مولانا شبلی کی شعرالعجم کا پورا پورا تتبع کیا ہے، وہ اسی طرح شعرالعرب بھی لکھنا چاہتے تھے، اس کے لئے اچھا خاصا مواد بھی اکٹھا کر لیا تھا، لیکن پھر اور علمی کاموں کی وجہ سے جس کا سلسلہ

ان کے انتقال تک قائم رہا، اس کی طرف توجہ کرنے کا موقع نہ مل سکا اور وہ بدقسمتی سے پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکی، انھوں نے نفس فن تنقید کی تاریخ پر بھی ایک مبسوط لکھی ہے، جو ابھی مسودہ کی صورت میں ہے، انھوں نے لیکی کی تاریخ اخلاق یورپ کے طرز پر تاریخ اخلاق اسلام کا بھی سلسلہ شروع کیا تھا، جس کی ایک جلد شائع بھی ہو چکی ہے، بقیہ جلدوں کے طبع و اشاعت کی نوبت ان کی زندگی میں نہ آسکی،

ان مستقل تصنیفات و تالیفات و تراجم کے علاوہ انھوں نے الندوہ، الہلال اور معارف میں مختلف موضوع پر بکثرت مضامین بھی لکھے، اور ان پر ان کو قبول عام کی سند بھی ملی، اگر یہ تمام مضامین فن وار اکٹھا کئے جائیں تو کئی جلدوں میں آئیں، ایک مرتبہ ان کے نواسے معتوق(?) صاحب ایم اے کو جو آج کل سکھر سندھ میں کلکٹری کے جلیل القدر عہدے پر فائز ہیں، ان کے مضامین کے جمع کرنے کا شوق پیدا ہوا تھا، بلکہ ان کے ادبی و تنقیدی مضامین اکٹھا بھی کر لئے تھے، اور خیال تھا، کہ جب بھی ان کو سہولت میسر ہوگی وہ اس کو ضرور شائع کریں گے، لیکن ہم اس کا انتظار ہی کرتے رہ گئے، اور وہ پاکستان چلے گئے، معلوم نہیں ان کا یہ مجموعہ محفوظ بھی ہے، یا ان کی شان تغافل سے نذر ہو گیا، اگر وہ شائع کر دیتے تو پرستاران ادب شبلی کے ہاتھوں میں تنقید کی ایک بہترین کتاب آجاتی، مولانا جہاں بہت بڑے مصنف، مؤلف اور مترجم تھے اردو زبان کے بہت بڑے نقاد بھی تھے اور ان کی یہ حیثیت بھی مسلّم ہے جس کا اب تک کسی نے انکار نہیں کیا ہے۔

مشہور فرانسیسی مستشرق موسیو لیبان کو اگرچہ سب سے پہلے سید علی بلگرامی نے اس کی دو اہم اور ضخیم کتابوں تمدن عرب و تمدن ہند کا ترجمہ کرکے اردو داں طبقے سے روشناس کیا ہے لیکن موسیو لیبان کے فلسفے کے سب سے بڑے شارح اور مترجم مولانا عبدالسلام ندوی تھے، اور اس کی بہت سی شاہکار چیزیں اردو میں منتقل کیں، انقلاب الامم اسی کی ایک فرنچ کتاب کے عربی ترجمہ سر تطور الامم کا ترجمہ ہے، جو اتنا رواں، شگفتہ اور دلنشیں انداز سے کہ اس پر اصل کا دھوکا ہوتا ہے، ہمارا خیال ہے، کہ اردو زبان میں شاید ہی اس سے بہتر کسی غیر زبان کی کتاب کا ترجمہ ہوا ہو، اس کو پڑھ کر اور تو اور مولانا ابوالکلام تک مسحور ہو گئے تھے اور مترجم کو بڑی داد دی تھی۔

یوں تو ان کی ہر کتاب خواہ وہ طبع زاد ہو یا ترجمہ شاہکار ہے، اور اردو کے خزانۂ ادب کا بیش بہا سرمایہ ہے، لیکن ان کی اسوۂ صحابہ تو وہ کتاب ہے، جس کی نظیر اردو و فارسی زبانیں تو الگ رہیں عربی کا وسیع لٹریچر بھی، اس موضوع پر اتنی جامع اور مکمل کتاب پیش نہیں کر سکتا، اس پر اردو زبان کو جتنا فخر ہو کم ہے، وہ دنیا میں ان کی بقائے دوام کی ضامن تو ہے ہی، آخرت میں بھی مغفرت و بخشش کا انشاء اللہ ذریعہ اور وسیلہ ہوگی، مرحوم علیہ الرحمہ فرمایا کرتے تھے، کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ میرے اعمال کا محاسبہ کرے گا، اور پوچھے گا کہ تم دنیا میں اتنے دن رہے تو کیا کرکے آئے، تو میں بے ساختہ کہہ دوں گا کہ حالی سے مسدس لکھوا لایا ہوں، اور اس کے طفیل میں خدا مجھ کو بخش دے گا۔ اسی طرح کارکنان دارالمصنفین سے جب خدا پوچھے گا کہ تم لوگوں نے دنیا میں کیا کیا، تو ان کا جواب یہی ہوگا کہ تیرے حبیب محبوب کی سیرت پر چھ ضخیم جلدوں کے علاوہ مولانا عبدالسلام سے اسوۂ صحابہ لکھوا لائے ہیں، تو یہ سن کر خدا خوش ہو جائے گا اور ان کو بخش دے گا۔

مولانا عبدالسلام کو موسیو لیبان کے فلسفہ اور اس کے افکار و نظریات سے اتنا شغف ہو گیا تھا، اور اس کے مختلف نظریات پر اتنے مضامین لکھے تھے، اور اپنے مضامین میں اس کی کتابوں کے اتنے اقتباسات نقل کئے، اور اس کثرت سے ان کے حوالے دیئے کہ ہم لوگوں نے مزاحاً ان کا نام ہی موسیو لیبان رکھ دیا تھا، غربی مصنفین میں وہ سب سے زیادہ موسیو لیبان کو اور عرب مصنفین میں سب سے زیادہ جاحظ کو پسند کرتے تھے، اس کی کتاب الحیوان اور کتاب البیان والتبیین کو فرصت کے اوقات میں اکثر پڑھتے تھے اور دوسروں کو بھی ان کے پڑھنے کی ترغیب دیتے تھے، عجیب ان پر بسط کی کیفیت طاری ہوتی تھی، تو اسی عالم نشاط میں بڑھانے کے لئے بھی تیار ہو جاتے تھے۔

یہ سب کچھ تھا، لیکن بہرحال وہ کانفرنسوں، انجمنوں، جلسوں اور ہنگاموں کے آدمی نہیں تھے، وہ اپنی پوری زندگی میں شبلی منزل کے معتکف رہے جس کی تعمیر میں ان کا بھی بہت بڑا حصہ ہے شاید ہی دو تین بار نکلے ہوں یا جلسوں میں خطبے دیئے ہوں، یا کبھی کسی جلسے کی صدارت کی ہو اس لئے ان کو جتنا کہ جاننا چاہئے تھا، لوگ نہ جان سکے، خود اعظم گڈھ میں، جو اُن کا وطن اور گلستان(?) سے بھی زیادہ ان کو عزیز تھا، ان کی صحیح قدر و منزلت، حقیقی عظمت و بزرگی، اور اُن کے عالمانہ تبحر سے کتنے لوگ واقف تھے، وہ شبلی منزل کی چہار دیواری کے رہنے والوں میں اتنا جذب ہو گئے تھے، کہ کسی طرح الگ ہو ہی نہیں سکتے تھے، شبلی کالج میگزین کا عبدالسلام نمبر درحقیقت معارف کے متخیلہ عبدالسلام نمبر کی ایک عملی شکل تھا، جس میں انھی لوگوں کے مضامین تھے جو ان سے بہت قریب تھے، یا اُن کو اچھی طرح جانتے تھے مثلاً مدیر معارف شاہ معین الدین ندوی، صباح الدین عبدالرحمن صاحب، مولانا سعید انصاری سابق رفیق دارالمصنفین و مولف سیر الصحابہ و سیر الصحابیات وغیرہ۔

(باقی صفحہ ۹ پر)

ہماری زبان

۲۲ ستمبر ۱۹۶۲ء

انجمن کی کل ہند کانفرنس

انجمن کی کل ہند کانفرنس امسال جے پور میں ۲۴، ۲۵ نومبر کو ہو رہی ہے۔ ریاستی شاخ نے ایک مجلس استقبالیہ بنادی ہے جس نے اپنا کام شروع کردیا ہے۔ کانفرنس کے تین کھلے اجلاس اور تین ڈیلی گیشوں کے اجلاس ہوں گے۔ کتابوں کی نمائش اور دو مشاعرے اس کے علاوہ ہوں گے۔ عن قریب ریاستی شاخ اور مجلس استقبالیہ کے مشورے سے کانفرنس کا افتتاح کرنے والے اور صدر کا اعلان کیا جائے گا۔ امید ہے کہ اس کانفرنس میں شاخوں کے نمائندے اور دوسرے مدعو حضرات بڑی تعداد میں شرکت کریں گے۔

کچھ لوگ یہ سوال کرسکتے ہیں کہ انجمن اس قسم کے کل ہند اجتماع کیوں کرتی ہے؟ انجمن کا کام تو خاموشی سے ٹھوس کام کرنا ہے۔ اُسے تو اُردو کے علمی و ادبی سرمائے میں قابل قدر اضافہ کرنا چاہیئے اور بس۔ مگر ہر صاحب نظر پر یہ بات روشن ہوگی کہ ادبی کاموں کے فروغ کے لئے بھی زبان کی بقا و ترقی کے لئے فضا ہموار کرنا ضروری ہے۔ اُردو زبان کو جس کے پیچھے صدیوں کے چلن کی بنیاد ہے اور جو ہماری مشترک تہذیب کی غیر فانی یادگار ہے اور جس میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ زندگی کے ہر موڑ پر ہماری ہر ضرورت کا ساتھ دے سکے اور جسے ہماری قومی زبانوں میں شامل کیا گیا ہے تاکہ اس کے سرمائے سے بھی راشٹر بھاشا کو فائدہ ہوسکے، آج بھی ہر جگہ اس کا حق نہیں ملا ہے۔ ویسے تو حکومت ہند، تمام اہم سیاسی پارٹیاں، دوسری زبانوں کے نمائندہ حضرات قومی کارکن اور ملک کے ادیب اور دانشور، اُردو کی اہمیت کا اعتراف کرتے ہیں اور اس کے ساتھ انصاف پر زور دیتے ہیں مگر کئی ریاستی حکومتوں نے اُردو کی تعلیم کا مناسب انتظام نہیں کیا ہے اور اس کے استعمال اور چلن میں دشواریاں چلی آرہی ہیں۔ اس سلسلے میں انجمن برابر متعلقہ حضرات کو توجہ دلاتی رہی ہے اور اس کے اثرات بھی ظاہر ہوئے ہیں، مگر یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ اس ہمدردی کے باوجود جو ارباب حل و عقد ظاہر کرتے ہیں، عملی دنیا میں صورت حال پہلے سے بہت زیادہ بہتر نہیں ہے اور اُردو پڑھنے والوں اور اُردو کے ذریعے سے اپنا کام چلانے والوں کی تعداد اس تیزی سے نہیں بڑھ رہی ہے جس کی آزاد ہندوستان میں جبکہ سب زبانوں کے لئے برابر ترقی کے مواقع مل رہے ہیں۔ ہمیں توقع ہونی چاہیئے۔ اس لئے ہم جب بھی ہوسکتا ہے، کل ہند کانفرنس کے ذریعے سے ایک طرف اپنی شاخوں کے کاموں کا جائزہ لیتے ہیں اور اُن کی بہتر تنظیم کے لئے منصوبے تیار کرتے ہیں، دوسری طرف کارکنوں کے تجربے سے فائدہ اٹھا کر اپنی کوتاہیوں اور خامیوں کی اصلاح کرتے ہیں، تیسری طرف اُردو کے مسئلے کو ایک طور پر پبلک و قوم کے سامنے لاتے ہیں۔ ۱۹۵۸ء میں دہلی کی کانفرنس نے حکومت ہند کی توجہ اُردو کے مسئلے پر مرکوز کرائی۔ ۱۹۶۰ء میں کانپور کی کانفرنس نے اُترپردیش کی حکومت کو متوجہ کیا اب ۱۹۶۲ء میں جے پور کی کانفرنس سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ نہ صرف راجستھان میں بلکہ دوسری ریاستوں میں بھی اُردو کی بقا اور ترقی کے لئے فضا پیدا کرے گی۔ کانفرنس کا پروگرام اور اس کے متعلق ضروری اطلاعات ہماری زبان میں شائع ہوتی رہیں گی۔ اس کانفرنس کا مقصد ایک شاندار جلسہ کرنا اور دھواں دھار تقریریں کرنا نہیں، اس کا اصلی مقصد اُردو دوستوں کو جمع کرکے ریاستوں کے مخصوص مسائل کا جائزہ لینا ہے اور مرکز کو جن امور کی طرف توجہ دلانا ہے اُن کے سلسلے میں اہمیت کے لحاظ سے کارروائی کرنی ہے۔ یہ دور اعداد و شمار کا دور ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اس موقع پر جو رپورٹیں پڑھی جائیں گی اور جو تجربات بیان کئے جائیں گے اُن کے پیچھے اعداد و شمار کی سند ہوگی۔ عام طور پر اب ملک میں اُردو دوستی کی فضا بڑھتی ہے، انصاف پسندی کا جذبہ بھی ترقی کر رہا ہے، قومی اور جمہوری نقطۂ نظر سے سوچنے کی بھی عادت ہوتی جارہی ہے، مگر عملی قدم اُٹھانے، خود کام کرنے اور دوسروں سے کام لینے کے لئے جس صبر و ضبط، جس استقلال اور پامردی عقیدے کی جس پختگی اور کردار کی جس مضبوطی اور اس کے ساتھ جدید دور کی ضروریات کے جس علم کی ضرورت ہے وہ ابھی پوری طرح سامنے نہیں آپایا۔ ہمیں امید ہے کہ اس کانفرنس کے ذریعے سے ہم اُردو تحریک کے احتجاجی دور سے نکل کر عملی دور میں قدم رکھ سکیں گے۔ احتجاج تو جہاں ضرورت ہوتی جاری ہی رہے گا، مگر عملی پہلوؤں اور کاموں پر بھی مناسب توجہ ہونی چاہیئے۔

کُل ہند اُردو کانفرنس جے پور

۱۳ ستمبر۔ جے پور (ڈاک سے) ۴ و ۳ و ۲ نومبر ۱۹۶۲ء کو کل ہند اُردو کانفرنس جے پور میں منعقد کیا جانا گذشتہ ماہ طے ہوا تھا۔ اُس سلسلے میں آج اس کے استقبالیہ کی کمیٹیوں کے صدر اور سکریٹریوں کی ایک خاص میٹنگ ۶ بجے شام پنڈت اومکار نرائن صاحب بہادر ریٹائرڈ کلکٹر راجستھان کی کوٹھی پر منعقد ہوئی اور جملہ اصحاب مندرجہ ذیل نے شرکت کی اور بعد تبادلۂ خیالات تمام کمیٹیوں نے اپنے اپنے فرائض سنبھال لئے۔ جملہ معاملات بلا کسی اختلاف حوصلہ افزا فضا میں طے ہو گئے۔ اس کانفرنس کے منتظم اعلیٰ پنڈت صاحب موصوف ہیں اور کمیٹیوں کے صدر و سکریٹری حسب ذیل اصحاب ہیں:

استقبالیہ کمیٹی۔ میجر خان محمد برکت اللہ خاں صاحب ملٹری سکریٹری گورنمنٹ راجستھان صدر، سید احمد علی شاہ صاحب قمر جعفری ریٹائرڈ کمشنر راجستھان سکریٹری۔

مالیاتی کمیٹی۔ پنڈت دامودر لال صاحب ویاس سابق ریونیو منسٹر راجستھان صدر، الطاف احمد صاحب خیری ریٹائرڈ چیئرمین ریونیو بورڈ راجستھان خازن، شیخ غفار علی صاحب ایڈوکیٹ راجستھان سکریٹری۔

نمائش کمیٹی۔ سید بشیر الدین صاحب لائبریرین راجستھان یونیورسٹی صدر، محمد سراج الحق صاحب لائبریرین مسلم ہائی اسکول جے پور سکریٹری۔

مشاعرہ کمیٹی۔ سید احمد علی شاہ صاحب قمر جعفری موصوف صدر، محمد افتخار علی صاحب شمیم سپرنٹنڈنٹ گورنمنٹ پریس راجستھان سکریٹری۔

پنڈال کمیٹی۔ نواب محمد عبدالباقی خاں۔ صدر، شیخ محمد ذوالفقار علی صاحب ریٹائرڈ ریونیو آفیسر میونسپلٹی جے پور سکریٹری۔

قیام و طعام کمیٹی۔ پنڈت رتن نرائن صاحب کول سکریٹری ریڈ کراس سوسائٹی راجستھان صدر، محمد عبدالحمید خاں صاحب ریٹائرڈ اسسٹنٹ انسپکٹر پولس راجستھان سکریٹری۔

نشر و اشاعت کمیٹی۔ نند لال صاحب نگم ہیڈ ماسٹر سانگانیری ہائی اسکول جے پور صدر، صاحبزادہ خلیل احمد خاں صاحب ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ سکریٹری۔

پیشوائی کمیٹی۔ سید ایوب علی صاحب عسکری ریٹائرڈ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولس راجستھان صدر، ارشاد احمد صاحب ہیڈ کلرک ملبوس ڈیپارٹمنٹ جے پور سکریٹری۔

انکوائری آفیسر۔ سید نور الحسن صاحب ریٹائرڈ ناظم (کلکٹر) ریاست جے پور۔

طبی مشیر۔ ڈاکٹر محمد عبدالقیوم خاں صاحب ایم بی۔ بی۔ ایس میڈیکل آفیسر سوائی مان سنگھ ہسپتال جے پور۔

سید اکرم علی صاحب بوجہ علالت شریک نہ ہو سکے باقی جملہ اصحاب نے شرکت کی اور ان کے علاوہ مولوی احترام الدین احمد صاحب شاغل جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو راجستھان، محمد بشیر الدین صاحب قریشی پرسنل اسسٹنٹ برائے ڈپٹی ایجوکیشن منسٹر راجستھان، محمد خدا داد خاں صاحب مونس بی۔ اے۔ بی۔ ایل ایل بی اسسٹنٹ سکریٹری انجمن ترقی اردو راجستھان، اور قاضی ظہیر الدین حسین صاحب تجلی اسسٹنٹ سکریٹری انجمن مذکور نے بھی شرکت کی میٹنگ کے وقت منتظم اعلیٰ صاحب نے شرکاء کو ایک پر تکلف ٹی پارٹی بھی دی۔

نمائش میں نادر و نایاب قلمی کتب۔ وصلیاں۔ خطاطی کے جواہر پارے۔ اور دوسری مطبوعہ نادر یا اہم کتابیں وغیرہ رکھی جائیں گی۔ آل انڈیا مشاعرہ طرحی ہوگا۔ طرح کا اعلان، پروگرام کی تفصیل اور دیگر ضروری معلومات عنقریب شائع ہوں گی۔

(نامہ نگار)

ہندستانی ادب کی ببلیوگرافی

ساہتیہ اکیڈمی نے اپنے قیام کے ساتھ ہی کام کا جو خاکہ مرتب کیا تھا اس میں ہندستانی ادب کی قومی ببلیوگرافی تیار کرنے کی اسکیم کو سب سے زیادہ اہمیت دی گئی تھی۔ اس سلسلے کی پہلی جلد، جو آسامی بنگلہ، انگریزی اور گجراتی ادب پر مشتمل ہے شائع ہو گئی ہے۔ اس کی قیمت پچاس روپے ہے۔

دوسری جلد جو ۱۹۶۳ء میں شائع ہوگی، ہندی، کنڑی، کشمیری اور ملیالم پر مشتمل ہوگی۔

تیسری جلد ۱۹۶۶ء میں نکلے گی۔ یہ اڑیہ، پنجابی اور سنسکرت پر مشتمل ہوگی۔

چوتھی جلد ۱۹۶۶ء میں نکلے گی، یہ سندھی، تامل، تلگو اور اُردو پر مشتمل ہوگی۔

ان چاروں جلدوں کو مرتب کرنے والوں کے نام یہ ہیں: ڈاکٹر برنجی کمار برو (آسامی)، ڈاکٹر سیو کمار سین (بنگلہ)، اوماشنکر جیٹھالال جوشی (گجراتی)، ڈاکٹر ہزاری پرشاد دویدی (ہندی)، اے۔ این۔ مرتھی راؤ (کنڑی)، جی۔ ایم۔ بیگ عارف (کشمیری)، سورانند کنجن پلے (ملیالم)، شنکر گنیش ڈاٹے (مراٹھی)، ڈاکٹر آر تتھاد لبھ ہنتی (اڑیہ)، ڈاکٹر گنڈا سنگھ (پنجابی)، دیانند کیشو داس منشارمانی (سندھی)، پنڈت رام ناتھن چیٹیار (تامل)، ڈاکٹر گڈیلو ونکٹا سیتاپتی (تلگو) اور پروفیسر آل احمد سرور (اُردو)۔

"افکار کا جوش نمبر"

کراچی۔ (ذریعہ ڈاک) جوش ملیح آبادی پر رسالہ "افکار" (کراچی) نے جو "جوش نمبر" کی صورت میں شائع کیا تھا اُسے کراچی یونیورسٹی نے ایم۔ اے۔ اُردو کے نصاب میں شامل کر لیا ہے۔

واضح رہے کہ پاکستان رائٹرز گلڈ نے "جوش نمبر" کو "ادبی کارنامہ" تسلیم کرتے ہوئے ایک ہزار روپیہ بطور انعام دیا تھا۔

وقار خلیل

یادیں

اک ان جانے کھوئے کھوئے پاگل زلفوں والے نے
ہم کو تم کو دیکھ لیا
کام و دہن سے اس لڑکے نے خوشیوں کی پچکاری چھوڑی

قوسِ قزح کی صورت یادیں
ابھریں، بکھریں، ڈوب گئیں
پل کے پل لڑکا غائب تھا

ویراں اور تنہا کھنڈروں میں
حدِ نظر تک سناٹا تھا
اُس زلفوں والے لڑکے کی
سوندھی سوندھی یاد کی خوشبو

رات گئے لوبان کی صورت
شمعوں سے آتی رہتی ہے
تیرہ راہوں کا سناٹا
سونے رستوں کی ویرانی
سوکھے ہونٹوں پر خوش حالی
اُس زلفوں والے لڑکے کی
آڑی، ٹیڑھی، ترچھی یادیں
نسیم و صبا کو دُہراتی ہیں

ساغر شکیلی

اے نگارِ خوابیدہ

اے نگارِ خوابیدہ
دل کے تار ٹوٹے ہیں
پھر بھی گنگناتا ہے
بربطِ تمنا پر
پھر بھی رقص کرتا ہے
رنگ و بو کی دنیا میں
اپنے روئے زیبا کی
چند رنگتیں لے کر
اس کے کھوئے سپنوں کو
آج پھر سجاتا ہے
دستِ مرمریں میں آج
جام دھر میں لے کر
اس دیارِ تشنہ میں
وقت کے پیاسوں کی
پیاس بھی بجھاتا ہے
گیسوئے معنبر کی
چند نکہتیں لے کر
اس بساطِ گلشن پر
خوشبوؤں کے آنچل کو
آج پھر بچھاتا ہے
اور اس کی خوشبو سے
ایٹم کی زہر آگیں
رقص کرتی لہروں کو
عنبریں بناتا ہے
گولیوں کے جمگھٹ میں
زندگی کی لاشوں پر
اپنے بال کے گجرے
اپنے ہار کے موتی
اپنی مانگ کا ٹیکا
آج پھر سجاتا ہے
اے نگارِ خوابیدہ
مفلسی کی راہوں میں
جب بھی کوئی دل جائے
آرزوؤں کا مارا
اس کے دل کی کھیتی پر
جس کا ایک اک پودا
زرد ہوتا جاتا ہے
بادلوں سے پانی کا
سیم و زر لٹاتا ہے
تاکہ یہ گرے پودے
پھر کھڑے تو ہو جائیں
اور لہلہا اٹھیں
اور مسکرا اٹھیں
ان کے لہلہانے میں
ان کے مسکرانے میں
کتنے آرزوؤں کی
خواب گاہیں جاگیں گی

ظہیر غازی پوری

غزل

وہ نظر مائلِ عتاب ہوئی   اب مری زندگی خراب ہوئی
شعلے اُڑنے لگے نفس کے ساتھ   عاشقی آج بے نقاب ہوئی
تیری آنکھوں کی مستیاں توبہ   ہر نظر ساغرِ شراب ہوئی
اے ظہیرؔ آپ کی غزل آخر
حسنِ معصوم کا جواب ہوئی

شانتی رنجن بھٹاچاریہ

ٹیگور خاندان اور فارسی و اُردو

ٹیگور خاندان کے کئی افراد نے فارسی، عربی و اُردو میں گہری دلچسپی لی ہے لیکن افسوس ہے کہ عام طور پر ٹیگور خاندان والے وہی سمجھے جاتے ہیں جن کے نام کے آخر میں لفظ "ٹیگور" شامل ہے حالانکہ یہ غلط اور ٹیگور خاندان کی ابتدائی تاریخ سے لاعلمی کا نتیجہ ہے۔ ٹیگور صرف ایک لقب ہے اور اس خاندان کے کئی لوگوں نے اس لقب کو اپنا لیا ہے۔ کئی ایسے بھی گزرے ہیں اور ہیں جو ٹیگور خاندان سے تعلق تو رکھتے ہیں لیکن اپنے نام کے ساتھ لفظ "ٹیگور" استعمال نہیں کرتے۔ اس کی وجہ معلوم کرنے کے لئے یہ جاننا ہوگا کہ "ٹیگور" کا لقب کب اور کیوں اس خاندان میں داخل ہوا۔ اس سے قبل اس خاندان والوں کو کیا کہا جاتا رہا ہے۔ ٹیگور خاندان کی ابتدا کہاں سے ہوئی وغیرہ۔ اور چونکہ یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں اس لئے اس پر سرسری روشنی ڈالتا ہوں۔

سنہ ۱۶۹۳ء میں بمقام "خاص کمار" ضلع راج شاہی میں رام چند مسر نے جنم لیا۔ وہ غریب آدمی تھا۔ اس کے تین لڑکے ہوئے گوپی بلوبھ مسر، موہن مسر، اور وشوا ناتھ مسر۔ گوپی بلوبھ اپنے گاؤں ہی میں رہے۔ چھوٹا بھائی وشوا ناتھ "کاجلا" نامی قصبہ میں جا بسا اور وہاں کا تعلقہ دار ہوا۔ ان تینوں بھائیوں میں سب سے زیادہ مشہور و مقبول مجھلا بھائی موہن مسر ہوا۔ اُس نے سنسکرت زبان پر عبور حاصل کیا اور سنسکرت کے مطالعے کے ساتھ ساتھ اس کے مذہبی خیالات میں گہرائی آتی گئی۔ دس سال ہی کی عمر میں وہ سادھو بن کر گھر سے نکل گیا۔ کئی سال تک مختلف مقامات کا سفر کرتا رہا، اور آخر کار "پاکوریا" ضلع بردوان میں جا بسا۔ رفتہ رفتہ اطراف کے دیہاتوں میں یہ بات پھیل گئی کہ ایک سادھو "پاکوریا" میں آیا ہے۔ لہٰذا لوگ اسے دیکھنے آنے لگے۔ موہن مسر یہاں چھ ماہ ٹھہرا اور اس دوران میں اس کے چیلوں کی تعداد کافی بڑھ گئی۔

راجہ کنکس نارائن بڑے با اثر آدمی تھے، وہ بھی موہن مسر کے چیلے بن گئے اور انھوں نے بھوانی دیوی سے ان کی شادی کرکے موہن مسر کو اپنا رشتے دار بنا لیا۔ شادی کے بعد موہن مسر پھر "پاکوریا" لوٹ آئے۔ یہاں کے لوگ انھیں اپنا گرو کہنے لگے۔ گرو کے لئے بنگلہ زبان میں لفظ "ٹھاکور" کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اور چونکہ موہن مسر "ٹھاکور" کہہ کر مشہور ہوئے اس لئے ان کے دوسرے اور تیسرے بیٹے یعنی شری گربھ اور کاشی ناتھ نے اپنے نام کے ساتھ "ٹھاکور" استعمال کیا۔ لیکن بڑے بھائی رتن گربھ نے باپ کی جگہ نہ لی اور نہ ہی اپنے نام کے ساتھ "ٹھاکور" کا استعمال قبول کیا۔

رتن گربھ کی اولاد نے بھی لقب "ٹھاکور" کو قبول نہیں کیا، صرف شری گربھ کے لڑکے "ٹھاکور" کہلائے۔ تیسرے بھائی کاشی ناتھ ٹھاکور بے اولاد تھے۔ اس طرح "ٹھاکور" کا سلسلہ آگے بڑھا۔ اور انگریزوں کے دور میں انگریزوں نے "ٹھاکور" کو "ٹیگور" کہنا شروع کیا۔ اس طرح اب ہم "ٹھاکور" کے بجائے "ٹیگور" ہی کہتے ہیں۔ حالانکہ بنگلہ زبان میں اب بھی "ٹھاکور" ہی کہا اور لکھا جاتا ہے۔ اگرچہ بنگال کے باہر کی دنیا اس خاندان کو "ٹیگور" خاندان کہتی ہے۔ اس لئے "ٹیگور" خاندان سے کئی ایسے افراد کا بھی تعلق ہے جن کے نام کے آخر میں "ٹیگور" نہیں لکھا جاتا ہے۔ اب میں مختصر طور پر اُن حضرات کا تذکرہ کرتا ہوں جو فارسی و اُردو سے اچھی طرح واقف تھے۔

رتن گربھ مجمدار

اس سلسلے میں پہلا نام رتن گربھ کا آتا ہے۔ آپ فارسی کے مشہور عالم اور نواب کے ملازم تھے۔ نواب نے انھیں "مجمدار" کا خطاب دیا تھا۔ اُن دنوں سماج میں یہ بات قابل قبول نہ تھی کہ مسلمانوں کے یہاں ملازمت کی جائے۔ اس لئے سماج نے انھیں نکال باہر کیا اور سماجی اصول کے تحت رتن گربھ کو اپنے والد کی جائداد کا حصّہ نہ ملا کیونکہ وہ دوسرے مذہب والے کے نمک خوار تھے۔ لیکن نواب کی ملازمت سے رتن گربھ نے کافی دھن دولت کمائی اور اپنے تین لڑکے راجہ رام، ابھی رام، اور ہری کشن کے لئے کافی جائداد چھوڑ گئے۔ یہ تینوں لڑکے بھی والد کی طرح فارسی زبان کے عالم ہوئے اور "مجمدار" کہلائے۔

دوارکا ناتھ ٹیگور

دوارکا ناتھ ٹیگور راجہ رام موہن رائے کے ساتھیوں میں سے تھے۔ ستی کی رسم روکنے کے لئے راجہ رام موہن رائے نے جو اپیل لارڈ ولیم بنٹنگ کو پیش کی تھی اُس پر دستخط کرنے والوں میں یہ بھی شامل تھے۔ ہفتہ وار "بنگ دوت" اور "بنگال ہرالڈ" کے حصّہ دار بھی تھے۔ "بنگ دوت" بنگلہ اور فارسی دونوں زبانوں میں شایع ہوتا تھا اور "بنگال ہرالڈ" انگریزی، بنگلہ، فارسی اور ناگری کا ہفتہ وار تھا۔ "بنگال ہرالڈ" کا پہلا شمارہ ۱۰ مئی سنہ ۱۸۲۹ء کو نکلا اور "بنگ دوت" کے اجراء کی درخواست نیل رتن ہالدر نے ۱۰ اپریل سنہ ۱۸۳۰ء کو دی تھی۔ مندرجہ بالا اخبارات میں حصّہ لینا ہی اس کا ایک ثبوت ہے کہ فارسی اور اُردو سے واقف تھے۔ مورخہ ۲ جولائی سنہ ۱۸۳۲ء کے اخبار "سماچار درپن" میں ضلع جسور کے ایک باشندے کا طویل خط فارسی کی حمایت میں شایع ہوا تھا۔ مراسلہ نگار نے اس خط میں ٹیگور خاندان کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ "کلکتہ میں مرحوم بابو گوپی موہن ٹیگور کا گھرانہ اسی سلسلہ میں (فارسی تعلیم کے سلسلے میں) مشہور ہے۔ (ستمبر سنہ ۱۸۱۹ء میں گوپی موہن ٹیگور کا انتقال ہوا) — لیکن بابو نند لال ٹیگور کی موت کے بعد اس خاندان والوں میں فارسی سے دلچسپی باقی نہ رہی کیونکہ اس خاندان پر نئی روشنی کی

کریں پڑنے لگیں اور وہ نئی روشنی سے متاثر ہو گئے۔ اس کے باوجود دوارکا ناتھ ٹیگور فارسی زبان سے واقف ہیں۔ کیونکہ ۲۴ پرگنہ کے کلکٹری میں آپ سررشتہ دار تھے اور آپ دستخط فارسی رسم خط میں کیا کرتے تھے۔"

راجہ دکھنا رنجن مکرجی

آپ نواب واجد علی شاہ (۱۸۳۷ء تا ۱۸۵۶ء) کے دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ اودھ کے تعلقداروں میں آپ واحد بنگالی تھے، جو گوپی موہن ٹیگور کے بیٹے سورج کمار ٹیگور کے نواسے تھے۔

راجہ دکھنا رنجن مکرجی ہندو کالج کلکتہ کے طالب علم تھے۔ لکھنؤ جانے سے قبل آپ کلکتہ میں بابو رشیاک کرشن ملک اور پیارے چاند متر کے ساتھ مل کر Bengal Spectator نامی انگریزی اخبار نکالتے رہے ہیں۔ کلکتہ بیتھون گرلس کالج کی زمین کا کچھ حصہ آپ ہی کا دیا ہوا ہے جو آپ نے ۱۸۵۰ء میں کالج کے نام لکھ دیا تھا۔ آپکو لارڈ کیننگ نے شنکرپور (رائے بریلی) کی تعلقداری دی اور راجہ کا خطاب بھی دیا تھا۔ آپ نے لکھنؤ میں تعلقداران اودھ کی انجمن بھی قائم کی اور پھر آپ نے لکھنؤ ہی میں ایک کالج کیننگ کالج کے نام سے قائم کیا۔ عرصے تک آپ تعلقداروں کی انجمن کے صدر بھی رہے اور انجمن کی طرف سے "لکھنؤ ٹائمس" نامی انگریزی اور "سماچار ہندوستانی" نامی اُردو اخبار بھی جاری کیا۔ ۱۸۶۲ء میں جب کلکتہ کے مشہور صحافی اور ہفتہ وار "رئیس و رعیت" کے اڈیٹر ڈاکٹر سمبھو چرن مکرجی لکھنؤ گئے تو راجہ دکھنا رنجن مکرجی نے انھیں تعلقداروں کی انجمن کا نائب صدر اور "سماچار ہندوستانی" کا مدیر مقرر کیا۔ ۱۸۶۳ء میں سمبھو چرن کلکتہ آگئے اور پھر سے راجہ دکھنا رنجن مکرجی نے "سماچار ہندوستانی" کو سنبھال لیا۔

مہارشی دیویندر ناتھ ٹیگور

سید نصیر حسین خاں خیال نے "مغل اور اُردو" میں لکھا ہے۔ "مشہور ٹیگور خاندان نے بھی فارسی و اُردو کی خدمت کی۔ ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور طوطیِ بنگالہ کے والد فارسی اور اُردو کے ماہر سمجھے گئے۔ حافظ کے وہ حافظ تھے۔" واقعی دیویندر ناتھ ٹیگور حافظ کے حافظ تھے۔ آپ کو حافظ اور فارسی شاعری سے والہانہ محبت تھی۔ آپ اُٹھتے بیٹھتے فارسی اشعار پڑھا کرتے تھے۔ تعجب نہیں ہے کہ انھوں نے خود بھی فارسی میں شعر کہے ہوں۔ اپنی خود نوشت سوانح حیات (بنگلہ میں) میں آپ نے جا بجا فارسی کے اشعار بھی نقل کئے ہیں۔

دیویندر ناتھ ٹیگور جنھوں نے "مہارشی" کا لقب پایا ۱۸۱۷ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم راجہ رام موہن رائے کے مدرسہ میں پائی اور بعد میں ہندو کالج میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ آپ کے دور میں اُردو بول چال کی عام زبان ضرور تھی لیکن عالموں کی نظر میں اس زبان کی قدر و قیمت کچھ نہ تھی اس کے باوجود آپ کی سوانح حیات میں ہمیں اُردو کے مکالمے بھی ملتے ہیں۔ آپ برٹش انڈیا ایسوسی ایشن کے صدر تھے اور اس انجمن کی طرف سے ۱۸۵۲ء میں فارسی میں ایک درخواست گورنر جنرل کی خدمت میں پیش کی گئی تھی۔ اس درخواست پر بحیثیت صدر، آپ کے فارسی میں دستخط ہیں۔ یہ درخواست برٹش میوزیم لائبریری لندن میں آج بھی محفوظ ہے۔

ابانندر ناتھ ٹیگور

بین الاقوامی شہرت یافتہ آرٹسٹ اور بنگلہ زبان کے نامور ادیب ابانندر ناتھ ٹیگور بھی فارسی سے واقف تھے، اور فارسی شاعری سے دلچسپی لیتے رہے۔ انھوں نے بنگلہ تصانیف میں کئی فارسی شعرا اور ان کے کلام کا ذکر کیا ہے۔

افسوس کہ بنگال کے اس مشہور خاندان میں اب نئی روشنی مکمل طور پر حاوی ہو چکی ہے اور اب اس خاندان والے فارسی و اُردو سے دلچسپی نہیں رکھتے۔

بقیہ

صاحب شعر الہند کی یاد میں دو خاص نمبر

اس نمبر کا ہر مضمون اخلاص و محبت سے لکھا گیا ہے اور اپنی جگہ پر بہت مکمل اور جامع ہے، شاہ معین الدین ندوی نے جو مولانا عبدالسلام کے صحیح معنی میں ہم لقمہ و ہم پیالہ تھے، اور صباح الدین عبدالرحمن صاحب نے مولانا مرحوم کی کردار نگاری کا حق ادا کر دیا ہے، جس کی داد ملک کے بڑے بڑے اہل نظر لوگوں نے مضمون نگار کو دی، مولانا شبلی کے اجلۂ تلامذہ میں ایک بزرگ پروفیسر عبدالباری ندوی ہیں، ان کی متعدد کتابیں دارالمصنفین کے سلسلۂ تصنیفات میں داخل ہیں، مثلاً مبادی علم انسانی اور برکلے وغیرہ انھوں نے خاص طور سے شاہ معین الدین کو اس مضمون پر داد دی، اور لکھا کہ عبدالسلام ندوی پر اس سے بہتر نہیں لکھا جا سکتا، اور یہ واقعہ ہے کہ انھوں نے کوزے میں دریا بھر دیا ہے، اس میں مولانا عبدالسلام ندوی کے متعلق ساری قابل ذکر اور اہم باتیں آگئی ہیں، یہ مضمون ان کی مستقل سوانح عمری کا بہترین ماخذ بن سکتا ہے۔ یہ مضمون اس سے پہلے مولانا کی وفات کے بعد معارف میں بھی شایع ہو چکا ہے، اس نمبر میں دوبارہ شایع ہوا ہے، صباح الدین صاحب کو اپنی نجی زندگی میں مولانا عبدالسلام جیسے نظر آئے، انھوں نے اس کو بڑی تفصیل سے لکھ دیا ہے، اس کو اس نقطۂ نظر سے نہیں پڑھنا چاہئے کہ وہ اسوۂ صحابہ و شعر الہند جیسی مایۂ ناز کتابوں کے مصنف اور فلسفۃ البیان کے شارح و مترجم کے حالات زندگی ہیں، بلکہ ایک بزرگ رفیق زندگی، اور ہمہ وقت کے ساتھی کے حالات ہیں، ملک کے مشہور صاحب طرز انشا پرداز جناب رشید احمد صاحب صدیقی نے جو خود بھی مولانا سے بہت زیادہ واقف ہیں، اور اگر چاہیں تو ان کی زندگی کے ادبی پہلو پر بہت اچھا اور شناسانہ مضمون لکھ سکتے ہیں، اور اگر کبھی فرصت میسر ہو تو ان کو لکھنا چاہئے بھی، اس مضمون کی بہت داد دی، اور لکھا کہ میں نہیں سمجھتا تھا کہ صباح الدین صاحب ایسا مضمون بھی لکھ سکتے ہیں، بہت خوب لکھا ہے۔ مولانا مرحوم کی پوری تصویر کھینچ کر رکھ دی ہے ان دونوں مضمونوں کے متعلق بعض حلقوں کا تاثر ان سے مختلف بھی ہے، ان کا خیال ہے، کہ ان میں کہیں کہیں مولانا کی تنقیص ہو گئی ہے، لیکن یہ صحیح نہیں ہے، اس نمبر میں ایک مضمون مولانا سعید انصاری سابق رفیق دارالمصنفین اور حال وارد پاکستان کا بھی ہے، یہ مضمون شروع سے آخر تک مولانا کے علمی و ادبی کارناموں پر ہے اور ان کی ایک ایک کتاب کا نام لے کر اس کا تعارف کرایا ہے، مولانا سعید انصاری مولانا شبلی کے تلامذہ میں سب سے زیادہ مولانا عبدالسلام سے متاثر تھے، اور ان کو علامہ سید سلیمان پر ترجیح دیتے تھے، اور تصنیف و تالیف میں ان کو اپنا استاد اور رہنما سمجھتے تھے، ان کا یہ مضمون ان کے اپنی تاثرات و جذبات و احساسات کا مظہر ہے، اس میں ایک جگہ اُن کے اولیات بیان کئے ہیں جن میں سے دو سے ہمیں بھی اتفاق ہے۔

ایک یہ کہ سب سے پہلے انہی نے علامہ شبلی کا طرز اختیار کیا، اور اس میں سب سے زیادہ کامیاب رہے، دوسرے یہ کہ فطرۃً ادیب اور شاعر پیدا ہوئے تھے۔

ان کے ذوق ادب و انشا کی آئینہ دار تو اُن کی کتابیں ہیں، جو انھوں نے مختلف موضوع پر لکھیں، لیکن انھوں نے جہاں تک ہم کو معلوم ہے، اپنے ملکۂ شاعری سے کچھ زیادہ کام نہیں لیا، ان کا مجموعۂ کلام گنتی کی چند غزلوں پر مشتمل ہے، وہ بھی تمامتر لکھنؤ کے رنگ میں ہیں، جن میں جذبات کم اور الفاظ کی جادوگری زیادہ ہے، اس لئے ہمارے نزدیک وہ شاعر کم اور ادیب و انشا پرداز زیادہ تھے،

شعر الہند کے معترضین و ناقدین کے جواب میں اس خاص نمبر کے نوعمر مگر ہونہار مرتب کا مضمون بھی خوب ہے، جس میں معترضین کے ایک ایک اعتراض کا تجزیہ کیا گیا ہے، اور اس کا مدلل اور مسکت جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے، اس مضمون کو بعض ممتاز ہفت ناموں نے بھی اپنے صفحات میں نقل کیا تھا، لیکن موضوع کی اہمیت کے پیش نظر ذرا مختصر ہے اس کو اور زیادہ پھیلا کر لکھنا چاہیے تھا۔

قدیم اصول تنقید کی روشنی میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں انصاف کا تقاضا ہے کہ ان کو انہی اصول کی روشنی میں پڑھا جائے، جو لوگ آج کل کے مغربی اصول تنقید کی روشنی میں اس دور کی کتابیں پڑھتے ہیں، اور ان پر بے محابا تنقید کرتے ہیں وہ درحقیقت ان کتابوں اور ان کے مصنفین کے ساتھ انصاف نہیں کرتے، مغربی اصول تنقید کسی کتاب کے پرکھنے کے لئے خواہ کتنے ہی اچھے ہوں، لیکن ان کی وجہ سے خواہ مخواہ قدیم اصول تنقید کو کنڈم نہیں کیا جا سکتا جیسا کہ آجکل کے ہر ادیب و نقاد کا ایک دستور سا ہو گیا ہے۔

اس خاص نمبر کے مرتب وہی کبیر احمد جائسی ہیں جنھوں نے جامعہ اُردو کے ماہنامہ ادیب کے ایک خاص نمبر کی صورت میں، مولانا عبدالسلام مرحوم کی بارگاہ علم و ادب میں اپنی عقیدت و محبت کا نذرانہ پیش کیا ہے۔ نگار کے مشہور و معروف جگر نمبر کی طرح، یہ نمبر بھی انہی کے ایک طویل مضمون پر مشتمل ہے جس میں مولانا عبدالسلام کی زندگی کے ایک ایک پہلو پر بہت تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے اور ان کے فضائل و مناقب بیان کئے ہیں۔

اس مضمون کے دیباچہ میں لائق مضمون نگار کو ایک جگہ سہو ہو گیا ہے، جس کی اصلاح کر دینی ضروری ہے، معارف کے صفحات میں ارباب دارالمصنفین اور خصوصاً مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا اسلم جیراج پوری میں جو تحریری مناظرہ ہوا تھا، اولاً تو وہ انکار حدیث و عدم انکار

حدیث پر نہیں تھا، بلکہ خبر احاد کے شرعی مسائل میں حجت و عدم حجت ہونے کے بارے میں تھا، سید صاحب کا ارشاد تھا اور یہی جمہور امت کا مسلک بھی ہے کہ حدیث متواتر کی طرح خبر احاد بھی قابل حجت ہے، اور مولانا اسلم جیراجپوری حدیث متواتر کو تو حجت مانتے تھے، لیکن خبر احاد کو قابل حجت نہیں سمجھتے تھے۔ اس بحث میں مولانا عبد السلام نے کوئی حصہ نہیں لیا تھا اور نہ سید صاحب نے ان کو اس کے لئے کبھی زحمت دی لیکن اس سلسلے میں ان دونوں بزرگوں کے جن مضامین کی مضمون نگار نے نشان دہی کی ہے، وہ ان کے زمانۂ طالب علمی کے مضامین ہیں، جو الندوہ میں شائع ہوئے تھے، ان مضامین کو اہل علم نے بہت پسند کیا تھا، انہی مضامین کو دیکھ کر مولانا شبلی نے مولانا ابو الکلام مولانا عبد اللہ عمادی اور مولانا سید سلیمان کے بعد الندوہ کی سب ایڈیٹری تفویض فرمادی تھی، جس کو انہوں نے بہت خوش اسلوبی سے انجام دیا، اور بہت بیش قیمت مضامین اس کے لئے لکھے، جن کی وجہ سے اُن کا نام اس وقت کے اعلیٰ علمی و ادبی حلقوں تک پہنچ گیا۔

انھوں نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں پہلا مضمون تناسخ پر لکھا تھا۔ مولانا شبلی نے اُس کو دیکھا، تو بہت پسند کیا اور بطور اظہار پسندیدگی کے بہت شوق سے الندوہ میں شائع کیا، اور اسی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ ملک کے مشہور صاحب طرز انشا پرداز اور ادیب مہدی افادی الاقتصادی کو جو الندوہ کے بڑے قدردان تھے، ان الفاظ میں اس کی خوش خبری پہنچائی:۔

"ہمارے یہاں ابھی ندوہ میں عبد السلام نہایت
قابل لڑکا ہے، جو غالباً خالی ہونے والی کرسیوں
کا مستحق ہوگا۔"

اس کے بعد مولانا عبد السلام کے الندوہ میں اور مضامین شائع ہوئے تو پھر ان کو لکھا:۔

"عبد السلام نہایت ہونہار ہے، وہ پورا مصنف
ہوسکتا ہے، اور ہوگا۔"

کون کہہ سکتا ہے کہ مولانا کی یہ تمام پیشین گوئیاں پوری نہیں ہوئیں، وہ علم و ادب کی خالی ہونے والی کرسیوں کے نہ صرف مستحق ہوئے، بلکہ اپنے دور کے بہت بڑے مصنف بھی ہوئے، جن کو اُردو ادب جب تک وہ زندہ ہے کبھی فراموش نہیں کرسکتا، انھوں نے حدیث، فقہ، کلام، تاریخ، فلسفہ، ادب، شاعری، سوانح نگاری ہر موضوع پر مضامین لکھے، جن پر بزرگوں اور قدردانوں نے ان کو داد دی، اور ان کے فضل و کمال کا اعتراف کیا۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

انجمن ترقی اُردو شاخ ساگر

ساگر۔ ۲۰ر ستمبر ۶۲ء۔ انجمن ترقی اُردو ساگر کے زیر اہتمام شبینہ مدارس کے کامیاب طلبہ کے تقسیم اسناد کا جلسہ زیر صدارت جناب ڈاکٹر ہی۔ پی۔ رائے، ایم۔ ایل۔ اے منعقد ہوا، ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر جناب تامسکر صاحب نے اسناد تقسیم فرمائیں۔

جناب صدر نے اپنی افتتاحیہ تقریر میں شبینہ مدارس کے کھولے جانے پر مسرت کا اظہار کرتے ہوئے انجمن کی علمی و ادبی سرگرمیوں کو سراہا۔ اُردو کی اہمیت اور ضرورت پر روشنی ڈالتے ہوئے انھوں نے فرمایا کہ ہمارے قومی کلچر کا دوسرا نام ہی "اُردو" ہے جسے کسی صورت میں فنا نہیں کیا جاسکتا۔

افتتاحیہ تقریر کے بعد جناب محمد حسین خاں مہر جنرل سکریٹری انجمن ترقی اُردو ساگر نے انجمن کی روداد پڑھ کر سنائی جو انجمن کی گذشتہ چھ ماہ کی سرگرمیوں کا مختصر سا خاکہ تھا۔

جناب صدر کی درخواست پر شہر کے معمر بزرگ اور سماجی کارکن جناب ماسٹر بلدیو پرشاد نے جلسہ کو خطاب کرتے ہوئے انجمن کے کارکنان کے کاموں کو قابل تعریف ٹھہرایا۔

آخر میں جناب تامسکر نے انجمن ترقی اُردو کی لائبریری اور شبینہ مدارس کے قیام پر مسرت کا اظہار کیا اور اپنے پورے تعاون اور ہر امکانی امداد کا وعدہ کیا۔ سیٹھ پریم چند جین صاحب نے معزز مہمانوں و ایجوکیشن آفیسر صاحب کا شکریہ ادا کیا۔ (محمد یوسف کھتری نائب سکریٹری)

انجمن معراج ادب گورکھپور

انجمن معراج ادب گورکھپور (یو۔پی) کا یہ جلسۂ مدیران میونسپل بورڈ گورکھپور سے مطالبہ کرتا ہے کہ بورڈ نے ووٹروں کی فہرست میں ناموں کو درست کرانے کے متعلق جو اشتہار صرف ہندی زبان میں شائع کرا کے شہر میں تقسیم کرایا ہے اس سے اُردو داں طبقہ مستفید نہیں ہوسکتا۔ اس لئے یہ جلسہ پُر زور مطالبہ کرتا ہے کہ اس قسم کا اشتہار اُردو زبان میں بھی شائع کرا کر شہر میں تقسیم کرائے تاکہ وہ ووٹر جو صرف اُردو زبان سے ہی واقف ہیں اشتہار کی روشنی میں اپنے ناموں کو ووٹروں کی فہرست میں درست کراسکیں کیونکہ یہاں پر اُردو داں طبقہ کی ایک کثیر تعداد آباد ہے۔
(مسرور یوسف زئی)

انجمن ترقی اردو بستی

۲۰ر ستمبر ۶۲ء کو ۶ بجے شام کے وقت انجمن ترقی اردو بستی کی مجلس انتظامیہ کا ایک ہنگامی جلسہ قاضی محمد عدیل عباسی ایڈووکیٹ کے مکان پر منعقد ہوا جس میں حسب ذیل تجویز اتفاق رائے سے منظور ہوئی۔

انجمن ترقی اردو بستی کی مجلس انتظامیہ کا یہ جلسہ حکومت یوپی کی مقرر کردہ لسانی کمیٹی کی سفارشات پر غور کرنے کے بعد یہ طے کرتا ہے کہ یہ رپورٹ نہ صرف یہ کہ حد درجہ غیر اطمینان بخش ہے بلکہ ہماری اردو کے لئے انتہائی مضرت رساں ہے۔ جلسے کی رائے میں رپورٹ کی بعض نمایاں خرابیاں حسب ذیل ہیں:-

(۱) کمیٹی نے اپنے حدود اختیارات سے قدم قدم پر تجاوز کیا ہے۔ حکومت یوپی نے یہ کمیٹی اس غرض سے بنائی تھی کہ وہ ان امور کا جائزہ لے کہ جو احکام وقتاً فوقتاً اردو کی ترقی کے لئے جاری کئے گئے ہیں ان پر کہاں تک عملدرآمد ہو رہا ہے۔ اور دستور میں جو اس کو حق دئے گئے ہیں اُن کی کہاں تک نگہداشت ہو رہی ہے۔ کمیٹی کو یہ اختیار نہیں تھا کہ بقاء و ترقی اردو کے نقطۂ نظر سے علٰحدہ ہو کر حکومت کی اسکیموں پر اپنی رائے دے۔ لیکن کمیٹی کا نقطۂ نگاہ اس کے صدر آچاریہ کرپلانی کے اس بیان سے واضح ہوتا ہے جو انھوں نے اخباری نمائندوں کو دیتے ہوئے فرمایا۔ یہ کہ "مجھے یقین ہے کہ یہ رپورٹ ہندی کو قومی زبان بنانے میں زیادہ کارگر ثابت ہوگی۔"

(۲) بیسک پرائمری اسکولوں میں اردو کی تعلیم کا جو انداز کمیٹی نے پیش کیا ہے اس سے اردو کی اپنی الگ پوزیشن باقی نہیں رہے گی، بلکہ وہ ہندی کا ایک اسلوب بن جائے گی اور ہندی الفاظ اور عبارتوں کو دیوناگری رسم الخط میں صفحہ جیسی ابتدا سے جاری کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بچے کو درجہ اول سے ہندی سیکھنی پڑے گی اور اس کے بعد بھی ذریعہ تعلیم اردو برائے نام رہ جائے گی اور مادری زبان کے ذریعہ تعلیم کا مقصد فوت ہو جائے گا۔

(۳) کمیٹی نے نہایت زور و شور سے اس امر کی سفارش تو کی ہے کہ ملازمتوں میں تقرری کے امتحان میں ایک پرچہ ہندی کا لازمی ہو اور کوئی ملازم بعد تقرری اس وقت تک مستقل نہ کیا جائے جب تک وہ سرکاری زبان میں کام کرنے کی اہلیت کا امتحان نہ پاس کر لے۔ لیکن مطالبہ کے باوجود کمیٹی نے اس پر غور نہیں کیا کہ کچہریوں میں اردو میں درخواستیں دینے کے لئے افسران اور اہلکاران کا اردو سے بھی واقف ہونا ضروری ہے۔ کمیٹی کا فیصلہ ایسی صحیح نہیں ہے کہ کچہریوں میں اردو میں درخواستیں لی جاتی ہیں اور کوئی دقت نہیں ہے۔

(۴) مطالبہ یہ کیا گیا تھا کہ مکاتب اسلامیہ میں چونکہ ذریعہ تعلیم اردو ہے اس لئے ان پر جو روپیہ منظور ہے وہ مثل سابق "..." قرار دیا جائے۔ پرائمری اسکولوں کے [illegible] دیا گیا ہے رکھا جائے۔ مطالبہ میں لوکل بورڈوں کی شکایت بھی کی گئی تھی کہ وہ رفتہ رفتہ ان مکاتب کی تعداد کو کم کر رہے ہیں۔ لیکن کمیٹی نے ان مکاتب کو بالکل لوکل بورڈوں کے حوالے کر دیا ہے۔ ان کا کریکولم تک بنانے کا اختیار لوکل بورڈوں کو دے دیا گیا ہے۔ ان کے رکگنائز ہونے اور امداد پانے اور ان کو عملی طور پر قائم رہنے پر انتہائی سخت پابندیاں عائد کر دی ہیں جن سے یہ یقین ہے کہ اگر ان سفارشات پر عمل کیا گیا تو یہ مکاتب ختم ہو جائیں گے۔

(۵) کمیٹی نے عربی، فارسی مدارس کے ابتدائی درجات کا کریکولم بیسک اسکولوں کا کریکولم قرار دے کر اردو کی اشاعت میں زبردست رکاوٹ پیدا کر دی ہے۔

(۶) کمیٹی نے ثانوی تعلیم ذریعہ اردو کو قطعی طور پر ختم کرنے کی سفارش کی ہے جو حکومت کی پالیسی میں مداخلت اور دستور کے خلاف ہے۔ حالانکہ سوالنامہ کے حصہ (۱) سوال نمبر ۵ کے مطابق کمیٹی کو یہ طے کرنا تھا کہ کیا ثانوی دور میں اردو کے ذریعے سے تعلیم دینے والے کسی ادارے کو تعلیم کے حصول کی شرطیں پوری کرنے پر بھی تعلیم کے حصول میں کوئی دشواری ہوئی۔ کمیٹی نے ثانوی تعلیم ذریعہ اردو ہی کو ختم کر دینے کی سفارش کی جو غیر آئینی ہے۔

(۷) کمیٹی نے کوئی ایسی متعین سفارشات مطالبہ کے باوجود نہیں کی ہیں جن سے اردو داں ججوں کی فراہمی میں سہولت پیدا ہو اور نہ اس پر کوئی تجویز دی ہے کہ کچہریوں میں اردو میں درخواستیں کیسے دی جا سکتی ہیں جب افسران اور اہلکاران یہ زور کہتے ہیں کہ ہم اردو نہیں جانتے اور اس لئے ہمیشہ اردو دستاویزات کو دیوناگری رسم الخط میں لکھوا کر "نقل مطابق اصل" اس پر وکیل سے درج کراتے ہیں۔

(۸) کمیٹی نے ایک بھی سفارش ایسی نہیں کی ہے جس سے بقاء ترقی اردو میں امداد ملے یا جو مروجہ طریقہ میں اضافہ ہو۔ البتہ اس کے بالکل برخلاف حکومت جہاں تک جا چکی تھی اس کو پیچھے گھسیٹنے اور اردو کی اشاعت میں رکاوٹیں ڈالنے کی باتیں سفارشات میں ہر جگہ نظر آتی ہیں۔

مجلس انتظامیہ کا ایک جلسہ یہ بھی طے کرتا ہے کہ جیسا کہ شروع ہی سے اعلان کیا جا چکا ہے انجمن ترقی اردو کے جو عہدیداران اس کمیٹی کے ممبر تھے اپنی انفرادی حیثیت سے شامل تھے اور ان کے آراء کی کوئی پابندی انجمن ترقی اردو پر نہیں ہے اور انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ سے درخواست کرتی ہے کہ وہ ہر مناسب کارروائی اس رپورٹ کے مسترد کرانے کے بارے میں عمل میں لائے۔

یہ بھی طے ہوا کہ اس تجویز کی نقول اخبارات اور سکریٹری انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ اور وزیر تعلیم و وزیر اعلیٰ ریاست اتر پردیش کو بھیج دی جائیں۔

محمد عدیل عباسی
صدر انجمن ترقی اردو بستی

ضروری اعلان: براہ مہربانی خط کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجئے۔ — منیجر

مراسلات

مول چند منشی کا شاہنامۂ اُردو

میرا ایک مضمون بعنوان "مول چند منشی کا شاہنامۂ اُردو" یکم اگست ۶۲ء کے اخبار ہماری زبان میں شائع ہوا ہے جس میں تذکرہ "آثار الشعرائے ہنود" کے مطابق مول چند کی تاریخ وفات ۱۲۴۲ھ/۱۸۲۶ء تحریر ہے۔ جبکہ ۱۸۶۷ء کے خطبے میں تاسی نے ۲۸ ستمبر ۱۸۶۶ء کو بمقام شملہ ایک دربار کا ہونا بتایا ہے جو ڈپٹی کمشنر کی زیر صدارت تعلیمی مسائل پر غور کرنے کے لئے منعقد کیا گیا تھا۔ دوسرے ذمہ دار حکام بھی اس میں شریک تھے۔ غریب طلبہ کی امداد کے لئے چندہ بھی اس میں ہوا اور موضوع زیر غور پر تقریریں بھی کی گئیں۔ اسی سلسلے میں انبالے کے انسپکٹر مدارس نے لالہ مول چند کے جوش کی تعریف کی جو وہ بچوں کی تعلیم کے لئے ظاہر کر رہے تھے۔ یہاں دتاسی نے یہ بھی بتا دیا ہے کہ یہ وہی لالہ صاحب ہیں جنہوں نے شاہنامے کا ہندستانی میں ترجمہ کیا ہے۔ گویا ان حالات سے بطور یقین معلوم ہوتا ہے کہ مول چند ۱۸۶۶ء/۱۲۸۳ھ میں بقید حیات تھے لہٰذا ان کی رحلت کی تاریخ مندرجہ مضمون صحیح ثابت نہیں ہوتی۔ قارئین کرام اس کو نوٹ فرمالیں۔

واقعہ مندرجہ خطبۂ صدر سے دو تین نتیجے اخذ ہوتے ہیں ایک تو یہ کہ منشی نے ترجمہ شاہنامہ جس زمانے میں کیا ہے اس میں ان کی عمر زیادہ نہیں تھی کیونکہ تاریخ ترجمہ ۱۲۴۱ھ/۱۸۲۵ء اور واقعۂ شملہ کی تاریخ ۱۸۶۶ء میں ۴۱ سال کا بعد ہے۔ اب اگر ۴۱ سال مذکور ان کی عمر اسی پچاسی برس کی بھی مان لی جائے تو وقت ترجمہ پچیس تیس سال کی عمر قیاس میں آتی ہے جو تصنیف و تالیف کے لئے کچھ زیادہ نہیں۔ دوسرے یہ کہ مول چند نے عمر طویل پائی ہوگی۔ نیز نسخہ محولہ مضمون ان کی حیات میں چھپ گیا تھا۔

۱۲۶۹ھ/۱۸۵۲ء میں اسی شاہنامے کا ایک اقتباس "رستم نامہ" کے نام سے شاہ محمد علی خاں کے مطبع فیض رساں میں منطبع ہوا ہے۔ اس میں سہراب و رستم کے تینوں مقابلوں کے مشتمل اشعار منقول ہیں۔ تصویریں بھی شاہنامے کے مطابق کشید کی گئی ہیں۔ خط اور کتابت کا نقشہ سادہ اور قلم ذرا جلی ہے۔ نیز املا بھی مروجہ استعمال کیا گیا ہے۔ صفحات ۸۰ ہیں اور تقطیع ہے۔ اور سائز شاہنامے کا سا ۸×۱۰ ہے۔ جو حسن اور حاشیہ دونوں پہلوں و ترتیب ولی کے مطابق اندراج کیا گیا ہے۔

پنڈت شیو نراین انسپکٹر مدارس ضلع لکھنؤ، مولوی حکیم الدین ہیڈ ماسٹر چوک اسکول لکھنؤ اور منشی غلام حسنین قدر مرحوم ہیڈ ماسٹر ہوبہ ضلع لکھنؤ و پروفیسر کیننگ کالج لکھنؤ کے تالیف کردہ "مجموعۂ سخن حصہ اول" سے مول چند کے متعلق یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ پنجاب میں ملازم ملتانی تھے وہاں "اکثر غلام سبحانی کے حضور رہتے تھے۔" نیز "بہت ممتاز تھے" اور بہت سے شاہی فرمانوں پر ان کے دستخط موجود ہیں۔

مجموعۂ سخن کا حوالہ آب حیات میں دیا گیا ہے۔ یہ کتاب طلبہ یونیورسٹی کے اردو نثر میں کورس میں داخل تھی حسب الحکم ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن ممالک مغربی و شمالی و اودھ ماہ فروری ۱۸۹۶ء/۱۳۱۳ھ میں پانچویں بار مطبع منشی نولکشور واقع لکھنؤ میں چھپی ہے منظومات کے ساتھ ہر نظم کی جز میں تمام و کمال مشتملہ درج ہے۔ آخر میں ایک فرہنگ شامل ہے۔ کل صفحات ۱۰۲ ہیں۔

شاہنامۂ مذکور کو ۱۸۶۵ء میں ۱۱×۸ کے سائز پر نولکشور پریس نے بھی اردو خط میں چھاپا ہے۔ اس کے ۱۰۰۴ صفحے ہیں۔

(معراج دھولپوری)

ریڈیو کی اُردو

ریڈیو کی ہندی کو عام فہم بنانے کا مطالبہ کیا گیا جنوبی ہند کی ہندی نہ جاننے والی آبادی کی طرف سے لیکن اس کا زد زیادہ تر اقلیت یعنی اُردو اور کبھی اس امر کی اطمینان دہی چاہی گئی کہ عام فہم انگریزی الفاظ کی حد تک تو غنیمت ہے لیکن ریڈیو کی ہندی کو عوام کے لئے قابل فہم بنانے کے بجائے سے ان عربی اور فارسی الفاظ کو استعمال نہیں کیا جائے گا جو انگریزی کے مقابلے میں کہیں زیادہ زمانے سے رائج ہیں لیکن جو نکل رہے ہیں عربی اور فارسی کے الفاظ اور کبھی اس حقیقت کو فراموش فرما کر کہ سوال صرف ہندی کو آسان تر بنانے کا ہے۔ لوک سبھا میں ریڈیو کی اُردو کو زیادہ آسان بنانے کا مطالبہ کیا گیا۔

حضرات اس حقیقت سے ناآشنا ہوں گے کہ اُردو کے تمام افعال ہندی ہیں اور صرف اسماء عربی اور فارسی زبانوں کے ہیں اب اگر ان اسماء کو بھی اُردو کو آسان تر بنانے کے لئے ترک کر دیا گیا تو اُردو زبان کا کوئی علیحدہ وجود باقی نہیں رہے گا۔ اور اُردو ڈاکٹر سمپورنانند کے الفاظ میں ہندی کی شیلی کے بجائے یکسر ہندی بن جائے گی۔

اسی طرح میں ہندی کو آسان تر بنانے کے موافقین میں نہیں ہوں۔ میں ان حضرات کی نیک نیتی کا احترام کرتا ہوں۔

لیکن جیسا کہ میں نے اپنی ایک ہندی تصنیف "سم پدا نکتا کیسے نشٹ ہو" میں بسط و شرح کے ساتھ دکھایا ہے بلکہ حکومت کی زبان عوام کی بول چال سے مختلف تھی مختلف ہے اور مختلف رہنا چاہئے۔ وزیر داخلہ کے لئے انگریزی میں ہوم منسٹر کا لفظ موجود ہے۔ اب اگر اس لفظ کا ترجمہ عوام کی بول چال کے مطابق یعنی یادش بخیر ہندستانی میں گھر وزیر یا گھر منتری کیا جائے گا تو خاص و عام دونوں کو عجیب سا معلوم ہوگا۔ بنا بریں ہوم منسٹر کے ترجمے کے لئے سنسکرت کا سہارا لینا پڑے گا اور گرہ منتری کو مقبول خاص و عام بنانا پڑے گا۔ اسی طرح ہندی کی خبروں کو پنچایت گھر کے پروگرام سے قطعاً مختلف زبان میں پیش کرنا ہوگا اور ہندستانی کے علم برداروں کے علی الرغم ادبی اور علمی ہندی میں سنسکرت کے الفاظ کو استعمال کرنا اسی طرح لازمی رہے گا جس طرح اُردو کے علیحدہ وجود کو باقی رکھنے کے لئے عربی اور فارسی الفاظ کا استعمال لازمی ہے۔

گزشتہ ہفتے میں ہماری زبان میں ملاپ دہلی کا ایک اقتباس شائع ہوا تھا جس میں ملاپ کے مدیر محترم نے ایسی آسان زبان کی ترویج کی تبلیغ کی تھی جس کو پنڈت اور مولوی کے علاوہ عوام بھی سمجھ سکیں لیکن موصوف نے "الٹریا تار" اور انگریزی الفاظ کو باقی رکھنے کی خواہش تو فرمائی تھی مگر کسی سنسکرت لفظ کے بجائے انگریزی لفظ کے علاوہ کسی اُردو لفظ کو پیش فرمانے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی تھی۔ اگر آسان زبان کے یہی معنی ہیں تو پھر اس سے تو کہیں بہتر ہے کہ ملک کے طول و عرض میں صرف سنسکرت یا صرف انگریزی کو قومی زبان قرار دے دیا جائے تاکہ اس طرح کم از کم لسانی وحدت حاصل ہو سکے۔　　(سید عباس طالب صفوی)

ضیاء احمد بدایونی

تبصرے

مجلۂ علوم اسلامیہ: بابتہ دسمبر ۱۹۷۱ء

یہ ادارۂ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی جانب سے
سال میں دو بار شایع ہوتا ہے۔
قیمت فی شمارہ پانچ روپے۔

مجلۂ مذکور پر بھی تبصرہ کسی سابق نمبر میں گذر چکا ہے۔ ادارۂ علوم اسلامیہ ایسے علمی اور مفید رسالے کو ترتیب دینے اور شایع کرنے پر مستحق مبارکباد ہے۔ اس شمارے میں چار مقالے ہیں اور چاروں معیاری اور تحقیقی۔ "مصحف عثمانی کے تاریخی نسخے" پر جناب ابو محفوظ الکریم کا مقالہ تاریخی تحقیق کا عمدہ نمونہ ہے۔ "رجال نہج البلاغہ" میں جناب محمود حسن امروہوی نے نہایت تلاش اور محنت سے دکھایا ہے کہ نہج البلاغہ مجموعۂ خطب، مکاتیب، مواعظ حضرت امیر المومنین علیؑ مرتبہ سید شریف رضی) کے متعدد رواۃ اور اقوال مستند اور مسلّمۂ فریقین ہیں۔ اس سلسلے میں عربی میں ما ہو نہج البلاغہ۔ مدارک نہج البلاغہ اور مفتی محمد عبدہٗ کا مقدمہ فارسی میں شرح نہج البلاغہ از سید محمود طالقانی۔ اور اردو میں مولانا عرشی کا مقالہ اور سید سبط الحسن کی منہاج نہج البلاغہ قابل مطالعہ ہیں۔ باقی دو مقالے "دیوان نجیب الدین جرباذقانی" اور "چہار صد ایراد بر کلام آزاد" بھی خوب اور پُر از معلومات ہیں۔ ضرورت ہے کہ ہمارے علمی ادارے، یونیورسٹیاں اور لائبریریاں اس رسالے کی سرپرستی کریں۔

ساگر سنگیت یا بحر ترنم

مترجمہ: منور لکھنوی
ناشر: آدرش کتاب گھر۔ دہلی
قیمت: ایک روپیہ پچاس پیسے۔

مسٹر سی آر داس کا نام پہلی بار تحریک خلافت و ترک موالات کے سلسلے میں سُننے میں آیا۔ اور پبلک نے ان کو ایک کامیاب وکیل اور ایثار پیشہ سیاسی لیڈر کی حیثیت سے جانا۔ مگر یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ وہ ایک ممتاز ادیب بھی تھے۔ ساگر سنگیت بنگالی زبان میں ان کے بھگتی اور تصوف کے افکار کا آئینہ ہے جس کو منور صاحب نے اُردو نثر میں منتقل کیا ہے۔ ساگر سنگیت کا ترجمہ ترنم بحر یا سرود بحر ہوتا تو اصل سے زیادہ قریب ہوتا۔ یہ روحانی نغمے جن میں جابجا مادیت کی جھلک۔ قاری کو حیرت میں ڈالتی ہے عجیب کیف و سرمستی سے معمور ہیں۔ ترجمہ منور صاحب نے کیا ہے اور بہت خوب کیا ہے۔

صدر کی گیتا یا بھگوت گیتائے منظوم

از منشی بچھمن پرشاد صدر لکھنوی

ہندو پاکستان کے ہر کتب فروش سے عنقا میں مل سکتی ہے۔

یہ کتاب جناب صدر کے "برادر معنوی اور دستگیر نواب سر محمد مزمل اللہ خاں بہادر رئیس بھیکم پور" کی روح مقدس کے نام منسوب کی گئی ہے۔ گیتا کے مختلف زبانوں میں ترجمے ہوئے ہیں۔ فارسی کا پہلا ترجمہ فیضی کی یادگار کہا جاتا ہے۔ اگرچہ یہ نسبت مشتبہ ہے۔ اُردو میں متعدد تراجم نثر اور نظم میں ملتے ہیں۔ زیر نظر منظوم اُردو ترجمہ جناب صدر کا ہے۔ صدر نے فیضی کے ترجمے کی پیروی کی ہے۔ اور بہت کامیاب پیروی کی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ فیضی کا نام نہاد ترجمہ بھی اکثر اصحاب کے نزدیک مستند نہیں ہے۔ موصوف کا خاندان فارسی و اُردو شعر و سخن اور علم و فضل میں ممتاز تھا۔ اس لئے زبان پر قدرت اور فن کی مہارت کا کیا پوچھنا۔ یہ مثنوی خاصی طویل ہے۔ اس کے باوجود زبان کی صفائی، بندشوں کی چستی اور کلام کا زور کہیں کم نہیں ہوتا۔ آخر میں صدر کی غیر منقوط مثنوی 'سدا' ہے جو ایک طرف تکلف اور دوسری طرف زور طبع کا نمونہ ہے۔

کتابیں ملیں

(تبصرے کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

بابائے اُردو مولوی عبدالحق

مرتب: عبداللطیف اعظمی
ناشر: ادارہ فروغ اُردو۔ لکھنؤ
سائز: ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۳۲۰۔ قیمت ۵۰ء۱۴ روپے۔

اُردو ناول کی تاریخ و تنقید

مصنف: ڈاکٹر محمد احسن فاروقی
ناشر: ادارہ فروغ اُردو۔ لکھنؤ
سائز: ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۲۵۶۔ قیمت ۳ روپے

روح دو عالم

مصنف: غلام حسین کلیم
ناشر: کتب خانہ انجمن ترقی اُردو۔ دہلی
سائز: ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۹۶۔ قیمت ایک روپیہ

جدید فارسی شاعری

مصنف: منیب الرحمٰن
ناشر: ادارۂ علوم اسلامیہ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
سائز: ۱۸×۲۲/۸ صفحات ۱۳۲۔ قیمت ۲ روپے

پبلشر نذیر حسن پرنٹر ضیاء الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپوا کر مرکزی انجمن سے شائع کیا